قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی ـــــ درس ۷

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۃُ النور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور' فون:03-35869501

www.tanzeem.org

نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ
اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ
وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ
وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿٣٥﴾ فِیْ بُیُوْتٍ
اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ
وَالْاٰصَالِ ﴿٣٦﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ
وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا
وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾ اَوْ
كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ
سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ
وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿٤٠﴾﴾ ...... صدق الله العظيم!

آج ہم قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے ساتویں درس کا آغاز کر رہے ہیں جومباحثِ ایمان کے ضمن میں تیسرا سبق ہے اور سورۃ النور کے پانچویں رکوع پر مشتمل ہے۔

سابقہ درس میں اولوالالباب یا صدّیقین کے شعوری اور اکتسابی ایمان کی وضاحت ایمانِ عقلی اور ایمانِ سمعی کے تدریجی مراحل کے حوالے سے ہوئی تھی۔ سورۃ النور کی مشہور ''آیتِ نور'' (آیت ۳۵) میں اس ایمان کو ایک نور قرار دے کر اس کی اصل حقیقت کو اس کے دو اجزائے ترکیبی یعنی ''نورِ فطرت'' اور ''نورِ وحی'' کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

> ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمک دار ستارے کی مانند روشن ہو' وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو' خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)''

یہ آیۂ مبارکہ پورے قرآن مجید میں بھی ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ بالخصوص سورۃ النور میں تو اس کی حیثیت بالکل ایسے ہے جیسے ایک نہایت قیمتی اور خوبصورت انگوٹھی ہو' جس کے درمیان میں نہایت قیمتی نگینہ جڑا ہوا ہو۔ اس لیے کہ یہ سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ النور کُل نو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ گویا پانچواں رکوع اس کے عین وسط میں واقع ہے' چار رکوع اس سے قبل ہیں اور چار اس کے بعد۔ اس رکوع میں ایمان اور اس کی اصل حقیقت کو تمثیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں ''ایمان کی حقیقت'' اور اس کی ''ماہیت'' کے لیے تمثیل لائی گئی ہے کہ وہ ایک نور ہے' ایک روشنی ہے جس سے انسان کا قلب' اس کا سینہ اور نتیجتاً اس کا

پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اس نور کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک وہ نورِ فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے اور دوسرا نورِ وحی جس سے نورِ فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

تمثیل یا تشبیہہ کا استعمال کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں تمثیلوں اور تشبیہوں کو اِس قدر کثرت سے کیوں استعمال فرمایا گیا ہے! یہ بات ہمیں جان لینی چاہیے کہ یہ معاملہ صرف قرآن مجید ہی کا نہیں ہے' بلکہ یہ تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے۔ خصوصاً انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے بیان ہوئی ہیں' جو نہایت اعلیٰ اور حد درجہ معنی خیز ہیں اور دنیا کی اکثر زبانوں کے کلاسیکل ادب میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ آسمانی ادب میں ان تمثیلوں کے بکثرت استعمال کا سبب یہ ہے کہ بعض مضامین اتنے لطیف ہوتے ہیں اور فہم وادراک کی عمومی سطح سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اوّلاً تو اُن کو صراحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ثانیاً اگر انہیں عام انداز میں بیان کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہو جائے اور عوام الناس کسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسری طرف ان لطیف اور ماورائی حقائق کا ایک اجمالی تصور انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے۔ لہٰذا آسمانی کتابوں میں ایسے حقائق کے ضمن میں تمثیل یا تشبیہہ کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے' تاکہ اس سے ہر شخص اپنے فہم وشعور کی سطح کے مطابق استفادہ کرے۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک حواری نے سوال کیا کہ ''استاد! آپ تمثیلوں میں گفتگو کیوں کرتے ہیں؟'' حضرت مسیحؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تاکہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہے''۔ حاصلِ کلام یہ کہ تمثیل کی احتیاج انسان کو ہے' اللہ کو نہیں۔ جیسے زیرِ مطالعہ آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ کو تو تمام چیزوں کا علم ہے''۔ اور یہ علم ''كَمَا حَقُّهٗ'' بھی ہے اور ''كَمَا هِيَ''

بھی۔ ہر شے کی اصل حقیقت اس پر روشن ہے۔ پس تمثیل کی احتیاج' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' اللہ کو نہیں' بلکہ اس کی ضرورت اصلاً ہمیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی آپ کے سامنے آ جائے تو مناسب ہوگا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانونِ اسلامی کی بنیاد صرف قرآن مجید پر نہیں ہے' بلکہ سنت رسول ﷺ بھی اس کی دوسری لازمی بنیاد ہے' تو بعض لوگ ناسمجھی کے باعث یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سنت کی ضرورت ہے' گویا قرآن سنت کا محتاج ہے! معاذ اللہ' اصل بات یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل و معاملات میں عملی رہنمائی کے حصول کے لیے سنتِ رسول ﷺ کے محتاج ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ کی جانب یہ ذکر (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا ہے' تاکہ آپؐ لوگوں کے لیے واضح کریں جو اُن کے لیے نازل کیا گیا ہے''۔

اس آیتِ مبارکہ کی رو سے قرآن کی تبیین' اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کا واضح اور روشن اسوہ اور نمونہ پیش کرنا' یہ تمام امور حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات و ارشادات نیز آپؐ کے عمل اور آپؐ کی سنت کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ بالکل یہی بات یہاں ہے کہ تمثیلوں کی احتیاج اللہ کو نہیں ہے بلکہ انسان کو ہے۔ اللہ تو ہر شے سے واقف ہے' ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

کیا اللہ کی ذات نور سے عبارت ہے؟

اب اس تمثیل پر غور کیجیے جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی روشنی اللہ ہی ہے''۔ ظاہر الفاظ سے یہاں ایک مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید یہاں ''نور'' کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے۔ اس مغالطے سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ' بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ

علیہ' وہ وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم ہمارے فہم وشعور' احساس وادراک' فکر ونظر' حتیٰ کہ تصور وتخیّل کی سرحدوں سے بہت دُور اور پرے ہے۔ بقول غالب :ع

''ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود!''

یا بقول شخصے :ع

''اے بروں از وہم وقیل وقالِ من!''

یا بقول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ : ''اَلعِجزُ عَن درکِ الذّاتِ اِدراکٌ ''یعنی اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا اقرار و اعتراف ہی اصل ادراک ہے۔ گویا ''معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!'' یعنی جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ میں اللہ کی ذات کو نہیں جان سکتا تو یہی کمالِ عرفان ہے۔ یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ: ''وَالبحثُ عن کُنہِ الذاتِ اِشراکٌ''یعنی اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ الغرض اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ آیتِ زیر درس میں وارد شدہ تمثیل اللہ کی ذات کے لیے نہیں بلکہ اس پر ایمان کی حقیقت کے بیان کے لیے ہے' گویا نور کے لفظ کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ پر نہیں' ایمان باللہ پر ہے۔

اس ضمن میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ نور لامحالہ کوئی مادی شے ہے یا کوئی عارضی کیفیت' اور ان دونوں کی نسبت باری تعالیٰ پر نہیں ہے' جیسا کہ عہد حاضر کے بعض مفسرین ومترجمینِ قرآن نے گمان کیا ہے۔ اس کی ایک قطعی اور حتمی دلیل اس آیتِ مبارکہ کے الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ اس میں دو مرتبہ ''نُورِہٖ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ جب کسی شے کی اضافت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو وہ شے اس کا غیر ہوتی ہے۔ جیسے میں کہوں ''میرا قلم'' تو اس میں ''قلم'' علیحدہ ہے اور ''میں'' علیحدہ ہوں' اور نسبتِ اضافی میرے اور قلم کے مابین ہے۔ تو ''نُورِہٖ'' کے معنی ہیں ''اس کا (یعنی اللہ کا) نور''۔ لہٰذا نور کا اطلاق ذاتِ باری

تعالیٰ پر درست نہیں ہے۔ اس کی ایک دوسری دلیلِ قطعی سورۃ الانعام کی پہلی آیتِ مبارکہ میں موجود ہے' جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہوسکتی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط﴾

''تمام شکر و سپاس اور تمام ثناء و تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین اور بنائے اندھیرے اور روشنی''۔

ثابت ہو گیا کہ نور ''مجعول'' یعنی بنائی ہوئی شے ہے اور ظاہر بات ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کو مجعول نہیں کہا جاسکتا۔

اب نور کو سمجھئے! ہم جس نور سے واقف ہیں وہ ''نورِ خارجی'' ہے' یعنی خارجی روشنی۔ یہ نور یا روشنی اصل میں اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم سب ایک ایسے کمرے میں موجود ہیں جہاں برقی قمقموں کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ کمرہ خوب روشن ہے اور جگمگا رہا ہے۔ اس صورت میں اس روشنی کے ذریعے ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں' لیکن کسی سبب سے فیوز اُڑ جائے اور روشنی چلی جائے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گے' درانحالیکہ ہم سب کی آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود رہے گی۔ گویا اشیاء کا ظہور بواسطۂ نور ہو رہا ہے۔ یہ ہے ہماری بصارتِ ظاہری جس کا ذریعہ بنتا ہے ایک مادی اور خارجی نور۔ اسی طرح ایک نور باطنی ہے جس سے حقائقِ اشیاء ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا منقول ہوئی ہے کہ: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں''۔ شاید اسی سے شاعر نے خیال مستعار لے کر کہا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو وہ جو ایک بصیرتِ باطنی ہے' اسے ایک نورِ باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نورِ باطنی ہے نورِ معرفتِ خداوندی۔ اسی نورِ معرفتِ خداوندی کا ذکر سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی

کے بعد دوسری آیت میں ہے:

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط﴾ (آیت ۲۵۷)

''اللہ اہل ایمان کا دوست ہے' ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔

گویا اللہ کو پہچان لیا تو اس کائنات کے جملہ حقائقِ کونیہ روشن ہو جائیں گے اور حقائقِ تکوینی کے ساتھ ساتھ حقائقِ تشریعی بھی اپنے جملہ اَسرار و حِکم کے ساتھ منور ہو جائیں گے اور ہر شے کی حقیقت نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ یہ جملہ حقائق منکشف ہو جائیں گے کہ آغاز کیا ہے اور اختتام کیا ہے؟ وجود کی ماہیت کیا ہے؟ موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کی حقیقت کیا ہے؟ شر کی حقیقت کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ مجازات و مکافات کیوں ضروری ہیں؟ یہ ساری چیزیں انسان کو معلوم ہو جائیں گی اگر وہ اللہ کو جان لے اور اس کو پہچان لے۔ جس طرح ہماری بصارتِ ظاہری کے لیے نورِ خارجی ضروری ہے' اسی طرح بصیرتِ باطنی کے لیے نورِ معنوی ضروری ہے' جو عبارت ہے معرفتِ خداوندی یا ایمان باللہ سے۔

پہلی تمثیل: ''مَثَلُ نُوْرِہٖ'' کا مفہوم!

اب آگے چلیے! ارشاد فرمایا: ﴿مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط﴾ ''اس کی روشنی کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو''۔ یہاں جو ''نُوْرِہٖ'' (اس کی روشنی) کے الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ متکلمین کی اکثریت نے اسے نورِ ہدایت قرار دیا ہے کہ یہ تمثیل نورِ ہدایت کے لیے ہے۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن ہے' کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن کو ''نور'' سے تعبیر کیا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ یہاں نور سے مراد ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس لیے کہ آپ ﷺ کے بارے میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۶ میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ آپؐ ایک روشن چراغ ہیں۔ ویسے ہم تینوں کو جمع کر لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ ہدایت' قرآن اور رسول اللہ ﷺ مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں' جیسے سورۃ البیّنہ میں ارشاد فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱﴾

''یہ سارے اہل کتاب اور یہ سارے مشرکین (اپنے کفر اور شرک سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس ''بیّنہ'' نہ آ جاتی''۔

آگے فرمایا کہ وہ ''البیّنۃ'' کیا ہے:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳﴾

''ایک رسول' اللہ کی طرف سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہیں''۔

گویا رسولِ خدا اور صحیفۂ خداوندی مل کر ایک وحدت بنتے ہیں اور اس طرح ''بیّنہ'' وجود میں آتی ہے' اور یہ ہے اللہ کی روشن دلیل' اللہ کی حجت' اللہ کی برہان۔

''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' کے ضمن میں دو صحابہؓ کی رائے بھی نہایت قابلِ غور ہے۔ یہ دونوں صحابہؓ وہ ہیں جن کی قرآن فہمی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے ہیں حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' سے مراد ہے ''مَثَلُ نُوْرِ مَنْ آمَنَ'' (مثال اس کے نور کی جو ایمان لایا) یعنی جو ایمان لے آئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور عطا ہوتا ہے' اُس نور کی مثال یہاں بیان ہو رہی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' سے مراد ہے ''مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ'' (اس کے نور کی مثال جو مؤمن کے قلب میں ہوتا ہے) گویا کہ یہاں مراد ہے نورِ ایمان۔ اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں ایک جانب صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (آیت ۷) ''لیکن اللہ نے ایمان کو تمہاری محبوب ترین متاع بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے''۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط﴾ (آیت۱۴) ''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

قلبِ مؤمن میں جو نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے آگے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے۔ اب ذرا آپ غور کیجیے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لائیے تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ ''ڈایا فرام'' جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے کہ: ﴿كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط﴾ ''جیسے ایک طاق ہو (اور) اس میں ایک چراغ رکھا ہو''۔ ﴿اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط﴾ ''یہ چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو''۔ ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر چراغ شیشے (فانوس) یا کسی قندیل میں نہ ہو تو چراغ کی لو ہوا سے اِدھر اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہے۔ جب چراغ شیشے (فانوس) یا قندیل میں ہوتا ہے تو لو ایک مرکز پر مرتکز اور ایک جگہ قائم رہتی ہے جس سے روشنی بالکل یکساں اور ہموار طور پر اپنے ماحول میں سرایت کرتی ہے۔

اب آگے اس تمثیل کی اصل فصاحت و بلاغت آ رہی ہے:

﴿اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط﴾

''فانوس کی کیفیت یہ ہو جیسے چمکتا اور جگمگاتا ستارا' وہ چراغ جلتا ہوا ایک ایسے بابرکت زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا روغن آپ سے آپ بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہو' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو''۔

اس زیتون کے درخت کے متعلق حبر الاُمّہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے زیتون کا ایسا درخت مراد ہے جو کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے یا کسی میدان میں یکہ وتنہا کھڑا ہے۔ ایسے درخت پر صبح سے لے کر شام تک مسلسل دھوپ پڑتی ہے'

گویا سورج کی حرارت وتمازت اثرانداز ہوتی ہے۔اس کے برعکس اگر درختوں کا کوئی جھنڈ ہوتو اگراس کے شرقی گوشے میں کوئی درخت ہوگا تو شام کی دھوپ اس کونہیں ملے گی اور اگر غربی گوشے میں ہوگا تو صبح کی دھوپ سے محروم رہے گا۔ یہ ہے مفہوم ''لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ'' کا۔حضرت ابن عباسؓ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے درخت کے پھل کا تیل نہایت صاف وشفاف ہوتا ہے اوراس میں روشن ہونے کی استعداد بدرجۂ تمام وکمال موجود ہوتی ہے۔آیت کے اس حصے میں زیتون کے اس درخت کے روغن کی یہ خصوصیت وکیفیت بیان ہوئی ہے کہ وہ اتنا صاف وشفاف ہے کہ بھڑ کنے اور مشتعل ہونے کے لیے بےتاب ہے' مچل رہا ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔جدید دَور میں اگر ہم اس کی مثال دیں تو وہ پٹرول ہے۔مٹی کے تیل سے بھی دِیا جلایا جاتا ہے' لیمپ اور لالٹین روشن کی جاتی ہے' سرسوں کے تیل سے بھی دِیا جلا لیا جاتا ہے' لیکن ان سب کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔اس کے لیے بتی چاہیے' کپڑا چاہیے' تب وہ جلے گا۔اس کو براہِ راست دیا سلائی دکھائیں تو وہ نہیں جلے گا۔اس کے برعکس پٹرول کا معاملہ ہے کہ دِیا سلائی اس سے ابھی دُور ہے' قریب بھی نہیں آئی' لیکن پٹرول خود آگے بڑھ کر آگ کو پکڑنے اور بھڑک اٹھنے کے لیے بے تاب ہے۔گویا یہاں ع ''نغمے بےتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے!'' والا انداز ہے۔

نورِفطرت اورنورِوحی کا امتزاج

پس اسی روغن سے درحقیقت ایک سلیم الفطرت انسان کی مثال دی گئی ہے جس نے اپنی انسانیت کے جوہر اور اپنی فطرت کی سلامتی کو محفوظ رکھا' اس میں کثافتیں نہیں آنے دیں۔چنانچہ اس میں نہ خواہشات وشہوات کی آلودگی پیدا ہونے دی اور نہ جاہلی عصبیتوں کے حجاب طاری ہونے دیے' بلکہ وہ اپنی اصل حقیقت پر سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت کے ساتھ قائم وبرقرار رہا۔ایسے سلیم الطبع انسان کی فطرت کا یہ صاف و شفاف روغن بھڑک اٹھنے کو تیار رہتا ہے۔اور اگر نورِوحی ذرا اس کے قریب آجائے تو اس کا باطن جگمگا اٹھتا ہے۔جیسے السّابقون الاوّلون صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب نورِوحی

سے فی الفور جگمگا اٹھے تھے اور انؓ کی فطرتِ سلیمہ نے فوراً تصدیق کر دی تھی کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے نبی و رسول ہیں۔

درحقیقت یہ مثال ان صدّیقین کے ایمان کی ہے کہ جو خود بے تاب ہوتے ہیں کہ جیسے ہی توحید و رسالت کی دعوت سامنے آئے اسے آگے بڑھ کر فی الفور قبول کر لیں۔ جیسے ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیت ۱۹۳ کا بھی مطالعہ کیا تھا:

﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا﴾

''اے ہمارے ربّ! یقیناً ہم نے سنا ایک پکارنے والے (کی پکار) کو کہ دعوت دے رہا ہے ایمان کی کہ ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر' پس ہم ایمان لے آئے''۔

گویا یہ ہے وہ نورِ ایمان جس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ اسی حقیقت کو اِس آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ﴾ ''نور پر نور''۔ دو انوار سے مرکب ہو کر وہ نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس سے اوّلاً انسان کا قلب منور ہوتا ہے اور ایک روشن چراغ کی صورت اختیار کر لیتا ہے' پھر وہ طاق منور ہوتا ہے یعنی پورا سینہ روشن ہو جاتا ہے' جس کی جانب اشارہ ہے: ﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ﴾ کے الفاظِ مبارکہ میں' پھر اِن اَنوار سے انسان کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کا وجود اپنی ذات میں خلقِ خدا کے لیے نورِ ہدایت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی عمل کا بدرجۂ تمام و کمال ظہور ہوا ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کہ وہ مجسم نورِ ہدایت اور قرآن مجید کے الفاظ میں ''سِرَاجًا مُّنِیۡرًا'' بن گئے۔

خلاصۂ کلام یہ واضح ہوا کہ ایمان درحقیقت ایک نور ہے جو دو اَنوار سے مرکب ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو ''نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ'' وجود میں آتا ہے اس کا محل و مقام ہے قلبِ انسانی —— اور ظاہر بات ہے کہ

جب انسان کا باطن اس نورِ ایمان سے منور ہو جائے گا تو اس کے آثار ونتائج ظاہر ہوں گے انسان کے رویے اور طرزِ عمل میں‘ اس کے اخلاق و کردار میں اور اس کی دلچسپیوں‘ امنگوں اور مشاغل میں —— چنانچہ اس درس کی اگلی دو آیات (۳۶‘۳۷) میں نورِ ایمان کے ان ہی آثار ومظاہر کا بیان ہے۔

ایمانِ حقیقی کے عملی مظاہر

ایمانِ حقیقی کے اِن عملی مظاہر کا ایک رُخ وہ ہے جس کی ایک جھلک درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں دکھائی جا چکی ہے‘ یعنی ایثار وقربانی‘ صبر ومصابرت‘ ثبات واستقلال‘ ہجرت وشہادت اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ —— اور دوسرا رُخ وہ ہے جو سورۃ النور کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں سامنے آتا ہے اور ذکر ومناجات‘ تضرّع واخبات‘ خوف وخشیت اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

’’(نورِ ایمان کی جلوہ گاہیں) اُن گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ ان میں ایسے جواں مرد صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں‘ جنہیں کوئی کاروبار اور خرید وفروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کر پاتی۔ (اور اس سب کے باوجود) وہ ایک ایسے دن (کے تصور) سے لرزاں وترساں رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گے۔ نتیجتاً اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید نوازے گا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے!‘‘

ان آیات میں پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ اس روئے ارضی پر خارجی اعتبار سے اس نورِ ایمانی کے سب سے بڑے مراکز مسجدیں ہیں۔ یہ اللہ کے وہ گھر ہیں جن میں اہلِ ایمان ہر روز پانچ مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ نورِ ایمان کا یہ ارتکاز اُن گھروں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے‘ یعنی ان کا ادب اور تعظیم کی جائے اور اس میں اس کا نام لیا جائے‘ یعنی اس کے نام کی مالا جپی جائے۔

آیت کے اس حصے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک بہت ہی عمدہ اور پیارا قول ہمیں ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں: **اَلمَساجدُ بیوتُ اللّٰہِ فی الارض' وھی تضیءُ لاھلِ السماءِ کما تضیءُ النّجومُ لاھلِ الارض** ''مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور وہ آسمان والوں کو اسی طرح چمکتی نظر آتی ہیں جیسے زمین والوں کو ستارے چمکتے نظر آتے ہیں'' —— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نورِ ایمان کے' جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا تھا' سب سے بڑے مراکز اللہ کے یہ گھر ہیں' اور جن لوگوں کے دلوں میں وہ نورِ ایمان پیدا ہو جاتا ہے بلاشبہ ان کے قلبی اطمینان اور دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز یہ مسجدیں ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا' جبکہ کسی کو بھی کہیں سایہ میسر نہیں ہوگا۔ ان میں ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہوں گے جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((وَرَجُلٌ قَلْبُــهٗ مُعَلَّقٌ فی الْمَسَاجِدِ))**[1] ''اور وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے''۔ ایسا شخص مسجد سے مجبوراً باہر نکلتا ہے' کیونکہ اس کے گھربار کی مصروفیات بھی ہیں' کاروبار کی ضروریات بھی ہیں اور دیگر حوائجِ ضروریہ بھی ہیں' لیکن مسجد کے باہر اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال لیا گیا ہو۔ گویا وہ ایک ضرورت اور مجبوری کے تحت مسجد سے نکلتا ہے' ورنہ اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے' اور وہ منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی پھر اَذان کی آواز آئے وہ فوراً لپک کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

یہاں بلند کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم مجرد تعمیر کرنا ہے۔ تعمیر کے لیے بھی کنایتاً لفظ ''رفع'' قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں آیا ہے:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ ...... وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب فضل اخفاء الصدقۃ۔

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۷)

''اور (یاد کرو) جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اور (ان کے ساتھ) اسمٰعیلؑ بھی''۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مساجد کی تعظیم و احترام ہے' یعنی مسجد کو ہر نوع کی گندگی اور نجاست سے بھی پاک صاف رکھنا اور ہر قسم کے لغو کاموں اور لغو گفتگو سے بھی محفوظ رکھنا۔ یہ تو ہے ظاہری تعظیم و احترام۔ جیسا کہ بیت الحرام کے متعلق اسی سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾

''اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہما السلام) سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں گے طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور وہاں رکوع و سجود (نماز) کے لیے آنے والوں کے لیے''۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسجدیں نجاستِ معنوی یعنی شرک اور بدعت سے بھی پاک ہوں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجنّ)

''اور یقیناً مساجد صرف اللہ ہی کے لیے ہیں' پس اس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''۔

مزید برآں الفاظ کے ظاہر سے یہ بھی متبادر اور مترشح ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر بلند رکھی جائے تاکہ وہ دُور سے نظر آئے' اسے بستی میں نمایاں مقام حاصل ہو اور وہ اس بستی کا مرکز معلوم ہو۔ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس کے اکثر الفاظ معانی و مفاہیم کا گنجینہ ہوتے ہیں' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ یہاں ''تُرْفَعَ'' میں یہ تینوں مفاہیم شامل ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل ابھی اس آیۂ کریمہ (۳۶) کے پہلے حصہ پر ہی اپنی توجہات کو مرکوز کیجیے۔ فرمایا:

﴿فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ......﴾

''ان گھروں میں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے......''

یہاں ہمارے دین کی ایک جامع اصطلاح ''ذکر'' کا بیان ہوا ہے۔ اس اصطلاح میں ہر نوع کا ذکر آ گیا ہے۔ نماز خود ایک ذکر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾﴾ ''نماز قائم کرو میرے ذکر (میری یاد) کے لیے''۔ جبکہ سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾ ''یقیناً ہم نے اتارا ہے یہ ''الذکر'' (یعنی قرآن مجید) اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں''۔ سورۂ ھود میں فرمایا:

﴿وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۰﴾﴾

''اور آیا (اے نبیؐ!) آپ کے پاس اس (قرآن) میں بلاشبہ ''الحق'' اور نصیحت اور یاد دہانی اہل ایمان کے لیے''۔

گویا خود قرآن حکیم ذکرِ کامل بھی ہے اور ذکرِ مجسم بھی۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰهِ یَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَیَتَدَارَسُوْنَهٗ بَیْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّكِیْنَةُ وَغَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِیْمَنْ عِنْدَهٗ))[1]

''جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں' اللہ کی کتاب کی تلاوت اور اس کے درس و تدریس (اور افہام و تفہیم) کے لیے تو اُن پر سکینت کا نزول ہوتا ہے' رحمتِ الٰہی ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے' فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ملأ اعلیٰ (یعنی ملائکۃ المقربین) کی محفل میں ذکر فرماتا ہے (کہ اِس وقت میرے کچھ بندے میرے گھر میں صرف میری کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جمع ہوئے ہیں)۔''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن والذکر

ان گھروں کے بارے میں جنہیں اللہ نے بلند کرنے اور ان میں اپنے نام کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے' آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡھَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۳۶﴾﴾
''ان گھروں میں صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے ہیں''۔

یہاں صبح کے وقت کے لیے لفظ ''غُدُوّ'' آیا ہے۔ ''غُدُوّ'' مصدر ہے' اس کی جمع نہیں ہوتی' قرآن مجید میں یہ لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے۔ آصَال' اَصِیل کی جمع الجمع ہے' ''اَصِیل'' کی جمع ''اُصُل'' اور اس کی جمع ''آصَال'' ہے۔ ان دو الفاظ ''غُدُوّ'' اور ''آصَال'' میں اشارہ ہے اس طرف کہ صبح کے وقت تو فرض نماز ایک ہی ہے' لیکن شام کے اوقات میں یعنی سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے رات کے تاریک ہونے تک چار فرض نمازیں ہیں' جن کا سلسلہ ظہر کی نماز سے شروع ہو کر عشاء کی نماز پر ختم ہوتا ہے۔ اسی کی طرف سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت مبارکہ میں اشارہ ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ﴾ (آیت ۷۸)

''نماز کو قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک' اور فجر کے وقت قرآن مجید کا پڑھنا''۔

''لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ'' اس میں ظہر سے عشاء تک کی چار فرض نمازیں آ گئیں اور ''قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ'' سے مراد صلوٰۃ الفجر ہے۔ اس طرح پانچ فرض نمازوں کا ذکر ہو گیا۔

دُنیوی مصروفیات میں اہل ایمان کا طرزِ عمل

اب ذرا دیکھئے' یہ کن لوگوں کا ذکر ہے؟ اور ان تسبیح و تحمید میں مشغول لوگوں کی اصل شان کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ﴾

''وہ (جواں ہمت) لوگ جنہیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و

فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے''۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہاں ''رِجَال'' سے مراد صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں خواتین بھی شامل ہیں اور یہاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر آیا ہے' اور اس سے مراد ہیں باہمت مَرد وزَن۔ اس لیے کہ اس دنیا میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے نمعلوم کتنے دباؤ' کتنے موانع' کتنی تحریضات اور کتنی ترغیبات ہیں جن سے اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے' اور اگر وہ اللہ کے ساتھ لَو لگائے رکھنا چاہتا ہے تو اسے نہایت شدید اور چومکھی کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے کے لیے بڑی مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہے' ورنہ کہیں تجارت انسان کو غافل کر دے گی اور کہیں کوئی نفع بخش سودا اپنے اندر ''گُم'' کرلے گا۔ اس لفظِ ''گُم'' سے بے اختیار ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق!

ایک خدا ناآشنا انسان دُنیوی مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں گم ہو جاتا ہے' لیکن جن لوگوں کا قلب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے منور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ پر حقیقتاً اور واقعتاً ایمان لے آتے ہیں تو اُن کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے ان الفاظِ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے: ''ان (باہمت) لوگوں کو غافل نہیں کر پاتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے''۔ یہاں ''تجارت'' عام ہے اور ''بیع'' خاص ہے۔ یہ **عَطفُ الخاص علی العام** کی ایک مثال ہے۔ ویسے بھی بیع میں فوری طور پر کوئی منفعت پیشِ نظر ہوتی ہے' جبکہ تجارت ایک وسیع تر اصطلاح ہے اور اس کا سلسلہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس میں غیر محسوس طور پر اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مضمون کی مناسبت سے تجارت پر بیع کا عطف کیا گیا ہے' اس لیے کہ جب کوئی سودا ہو رہا ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اس سودے میں مجھے فوری طور پر کتنا نفع حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا یہ وسوسہ دل میں پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی

بات نہیں ہے کہ اگر اذان کی آواز آ گئی ہے تو کیا ہوا؟ ذرا یہ سودا پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو مسجد کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اور اگر جماعت چلی بھی جائے تو میں علیحدہ نماز پڑھ لوں گا‘ لیکن اِس وقت یہ سودا چھوڑنا گھاٹے کا معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن ان باہمت لوگوں کا جن کے قلوب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے روشن ہوتے ہیں‘ حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر پاتی۔ اس موقع پر سورۃ المنٰفقون کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں لایئے جس میں فرمایا گیا کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹﴾

’’اے اہل ایمان! تمہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں‘ اور جو کوئی یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا تو یقیناً وہی خسارے میں رہنے والے ہیں‘‘۔

اگر ان میں منہمک اور مشغول ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے تو جان لو کہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہے۔ ان باہمت لوگوں کو کوئی تجارت اور خرید و فروخت نہ ذکرِ الٰہی سے غافل کر سکتی ہے نہ ہی نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔ گویا نہ انسان دُنیوی مصروفیات میں اتنا گم ہو جائے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام نہ رہے اور نہ مال کی محبت اس پر اتنی غالب آ جائے کہ زکوٰۃ ادا کرنی بھی دوبھر نظر آنے لگے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ تو اصلاً قلب و نفس پر سے مال کی محبت کی گرہ کھولنے کا ذریعہ ہے‘ ورنہ تزکیۂ نفس کے لیے تو نہ صرف یہ کہ ہر سال نصاب کے مطابق زکوٰۃ دینی لازم ہے بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ابنائے نوع کی حاجت روائی اور مشکلات رفع کرنے کے لیے صدقاتِ نافلہ کا اہتمام لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ))[1] ’’بلاشبہ تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مستحقین کا حق ہے‘‘۔ اور بطورِ استشہاد آپ ﷺ نے آیتِ بِرّ (سورۃ البقرۃ

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزکاۃ‘ باب ان فی المال حق سوی الزکاۃ۔

کی آیت ۱۷۷) کا حوالہ دیا‘ جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ یعنی:

﴿...... وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ﴾

’’......اور (حقیقی نیکی اس کی ہے) جس نے دیا مال اس کی محبت کے علی الرغم قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں‘ اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔‘‘

آگے فرمایا کہ مساجد سے اتنی محبت اور ذکر و شغل کے دوام اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے التزام کے باوصف ان باہمت لوگوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ ان میں اپنی دین داری کا کوئی تکبر‘ کوئی عُجب‘ کوئی پندار اور کوئی گھمنڈ پیدا ہو جائے‘ بلکہ ان تمام حسنات اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾﴾ ’’وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔‘‘ یعنی وہ لرزہ براندام رہتے ہیں‘ کانپتے رہتے ہیں‘ لرزاں و ترساں رہتے ہیں اس دن کے خیال سے جس کی ہولناکی کا عالَم یہ ہے کہ اُس دن دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ یہ کنایہ اور استعارہ ہے قیامت کی ہیبت اور اس کے شدائد و مصائب کے لیے۔ وہ دن جس کے لیے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿١٧﴾﴾ ’’وہ دن کہ جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا‘‘۔ یہ باہمت لوگ اللہ سے لو لگانے اور ہر دم اس کی یاد کا التزام کرنے کے باوجود اُس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس دن ہر ابن آدم عدالتِ خداوندی میں محاسبہ کے لیے کھڑا ہو گا۔

آگے فرمایا: ﴿لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ ’’تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے ان کے بہترین اعمال کی‘‘۔ یہاں ابتدا میں جو حرفِ جار ’’لام‘‘ آیا ہے اسے لامِ عاقبت کہا جاتا ہے۔ گویا کہنا یہ مقصود ہے کہ اصحابِ ایمان و یقین کی ان کیفیات کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے گا۔ قرآن حکیم کے اکثر مترجمین نے

''اَحۡسَنَ'' کی نسبت ''جَزَاء'' سے قائم کی ہے' یعنی اللہ انہیں ان کے اعمال کی بہت عمدہ' اعلیٰ اور احسن جزا دے گا۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''اَحۡسَنَ'' کا تعلق ''مَا عَمِلُوۡا'' سے ہے' اس لیے کہ قرآن حکیم کے بعض دوسرے مقامات پر (جیسے سورۃ النحل کی آیات ۹۶ اور ۹۷) اعمالِ صالحہ کی اُخروی جزا کے ذکر میں ''اَحۡسَنَ'' کے ساتھ حرفِ جار ''ب'' بھی آیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اجر کا فیصلہ اور اُن کے مرتبہ و مقام کا تعین ان کے بہترین اعمال کی مناسبت سے کرے گا' اس لیے کہ اچھے سے اچھے انسان کے بھی تمام اعمال برابر اور مساوی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہوتے' ان میں کچھ نہ کچھ فرق و تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ کوتاہیاں اور خطائیں بھی ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: اَلۡاِنۡسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الۡخَطَأ وَالنِّسۡیَانِ یعنی انسان دو چیزوں کا پتلا ہے' اس سے غلطی کا ارتکاب اور خطا کا صدور بھی ہو جاتا ہے اور بھول چوک تو اس کی جبلت اور خمیر ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعمال میں سے جو بہترین اور چوٹی کے اعمال ہوں گے ان کے اعتبار سے حساب لگایا جائے گا اور ان کی جزا ان کے اعلیٰ ترین اعمال کی مناسبت سے مترتب ہوگی۔ کم تر درجے کے اعمال نظر انداز کر دیے جائیں گے اور جو کوتاہیاں اور خطائیں ہوں گی انہیں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ غفاری و رحیمی سے ان کے نامۂ اعمال میں سے حذف کر دے گا۔ گویا انہیں اپنی شانِ ستاری سے ڈھانپ لے گا۔ جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعے کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ﴾ ''میں لازماً ان کی برائیوں کو اُن سے دُور کر دوں گا''۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے دوران ان کے دامنِ کردار کے داغ دھبے دھو دے گا اور ان کے نفوس کا تزکیہ فرما دے گا۔ اور یہ بھی کہ آخرت میں ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھو دے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ: ﴿وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ﴾ ''اور میں لازماً ان کو ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی''۔ یا جیسے سورۂ ھود میں یہ اصول بیان فرمایا: ﴿اِنَّ

الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ (آیت ۱۱۴) ''یقیناً بھلائیاں برائیوں کومحو کر دیتی ہیں''۔ لہٰذا ان باہمت لوگوں کا آخرت میں جو مقام اور مرتبہ معین ہوگا وہ ان کے اعلیٰ اوراحسن اعمال کی نسبت ومناسبت اوراعتبار سے ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ اصول سمجھ لیجیے کہ جیسے دنیا میں اُجرت محنت ومشقت کی نسبت سے ملتی ہے' اسی طرح آخرت میں اجراور جزا کا معاملہ تو اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہی ہوگا' خواہ اعلیٰ ترین اعمال ہی کی مناسبت سے ہو۔ اس پر مزید ہے وہ فضل جو اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے عنایت فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ ''اوراللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے مزید عطا فرمائے گا''۔ واضح رہے کہ یہ فضل کسی محنت کا صلہ نہیں ہوتا' بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے' لہٰذا یہ کسی حساب کتاب کی پابندنہیں ہے' بلکہ یہ اللہ کی شانِ جود وسخا کا ظہور ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴿۳۸﴾﴾ ''اوراللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بلاحدّ وحساب''۔ گویا اس کا فضل بلانہایت ہے اوراس کی کوئی حدنہیں ہے۔

اس مقام پرتھوڑا سا توقف فرما کرآج کے سبق کوگزشتہ سبق سے ملا کرایک حقیقی بندۂ مؤمن یا بقول اقبال ''مردِمؤمن'' کی شخصیت کامکمل نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجیے۔ ہمارا درس ششم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی ایمان کی ترکیب بیان ہوئی ہے کہ ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور پھر ایمان بالرسالت کیسے وجود میں آتا ہے۔ اس کے بعد ایک جامع آیت میں بندۂ مؤمن کے سیرت وکردار کی تصویر کے ایک رُخ کی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہے وہ نقشہ جس کے خدّ وخال ہیں سعی و جہد' ایثار وقربانی' جہاد وقتال اورصبر ومصابرت۔ چنانچہ وہاں الفاظ ہیں:

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾

''پس جن لوگوں نے (میرے لیے) ہجرت کی اوراپنے گھروں سے نکالے

گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں (تکلیفیں دی گئیں)
اور جنھوں نے (میرے لیے) جہاد وقتال کیا اور (میری راہ میں) قتل کر
دیے گئے۔''

یہ ہے بندۂ مؤمن کے سیرت و کردار کی تصویر کا ایک رُخ، یعنی جدوجہد' کوشش و محنت' کشمکش و تصادم' صبر و ثبات' ایثار و قربانی' جہاد و قتال حتیٰ کہ جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔ اسی تصویر کا دوسرا رُخ مساجد کے ساتھ ایک قلبی اُنس' ذکرِ الٰہی کے دوام اور ان کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے' اور اس میں ذوق و شوق' ذکر و شغل اور انابت و اطاعت پر مستزاد سونے پر سہاگے کی مثال ہے خوف اور خشیتِ الٰہی' جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور تصویر کا صحیح تصور اُن دونوں رُخوں ہی سے مکمل ہوتا ہے' اسی طرح اگر بندۂ مؤمن کی شخصیت کا بھی صرف ایک رُخ سامنے رہے گا تو شخصیت بھی یک رُخی رہے گی۔ چنانچہ اسی کے مظاہر آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اصل میں ایک مردِ مؤمن یا انسانِ مطلوب کی شخصیت کے یہ دونوں رُخ مطلوب ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت میں یہ دونوں رُخ بیک وقت موجود ہوں۔ چنانچہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں یہ دونوں رنگ بتمام و کمال اور بیک وقت نظر آتے ہیں اور اس کی گواہی دشمنوں تک نے دی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: **اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ** ''اصل فضیلت وہی ہے جس کی گواہی دشمن دیں''۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب سلطنتِ کسریٰ سے مسلح تصادم ہوا تو ایرانی افواج کے جاسوسوں اور مخبروں نے مسلمان افواج کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر اپنے سپہ سالار کو جو رپورٹ دی تھی اس کے یہ الفاظ نہایت قابلِ غور ہیں اور اُن کی ذہانت و فطانت پر دلالت کرتے ہیں کہ: **هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ** یعنی یہ عجیب لوگ ہیں' دن میں یہ شہسواروں کے روپ میں نظر آتے ہیں اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت

یہی لوگ راہب بن جاتے ہیں اور مُصلّوں پر کھڑے نظر آتے ہیں' ان کے آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہیں تر ہو جاتی ہیں اور اسی طرح اپنے ربّ کے حضور الحاح وزاری میں اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے ہیں۔

پس ایک بندۂ مؤمن کی مکمل شخصیت ''هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ'' کے امتزاج ہی سے وجود میں آتی ہے۔ ہمارے سامنے ''فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ'' والا رُخ گزشتہ سبق میں آیا تھا اور ''رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ'' کی صحیح تعبیر سطورِ بالا میں سامنے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو' ادنیٰ درجے میں ہی سہی' اِن اوصاف کا جامع مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے جو اِن دو اسباق میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

ظلمتِ کفر کے دو درجے

اب ہم اس رکوع کی آخری دو آیاتِ مبارکہ پر کسی قدر غور و تدبّر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آیئے پہلے ان آیات کا ایک سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُـهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۳۹ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَـهٗ نُوْرًا فَمَا لَـهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝۴۰﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی' البتہ اللہ کو اپنے پاس موجود پاتا ہے جو اُس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا اُن اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر (سایہ کیے) ہوں بادل۔ (گویا) تاریکیاں ہیں تہ بر تہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے

تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں!''

ترجمے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان آیات میں کفر کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو عربی کے ایک مقولے میں سامنے آتا ہے کہ **تُعرفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا** ''اشیاء کی صحیح معرفت اُن کے اضداد کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے''۔ یعنی کسی شے کی حقیقت کو ایک تو آپ خود اُس شے پر غور و فکر کر کے سمجھ سکتے ہیں اور دوسرے اس طور سے کہ اُس چیز کی ضد پر غور کیا جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے' تو اس سے بھی اس شے کی حقیقت پر روشنی پڑے گی اور وہ منقّح اور واضح ہو کر شعور و ادراک کی گرفت میں آ جائے گی۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ دن کی اصل حقیقت رات کے پس منظر میں خوب نمایاں ہوتی ہے اور روشنی کی حقیقت تاریکی کے تقابل میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے ایک طرف تو سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سامنے آ چکی ہے جس میں ایمان کو ایک نور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو مرکب ہے دو انوار سے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس کا محل و مقام ہے قلبِ انسانی۔

اس کے بعد آیات ۳۶ تا ۳۸ میں ایمان کے اس نورِ باطنی کے انسانی شخصیت میں ظہور کی دو صورتوں میں سے ایک کو نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ اسی حقیقتِ ایمان کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے آیات ۳۹' ۴۰ میں ایمانِ حقیقی کے نور سے محروم انسانوں کی شخصیت کی جھلک دو تمثیلوں کے پیرائے میں دکھا دی گئی۔ مجرد الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان تمثیلوں میں سے پہلی تمثیل میں کچھ روشنی اور تاریکی کے بین بین کی سی کیفیت سامنے آتی ہے' جبکہ دوسری تمثیل میں تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم دقتِ نگاہ سے مشاہدہ کیا جائے تو اِن ظاہری الفاظ کے پردوں میں ہدایت و حکمت کے نہایت قیمتی موتی چھپے ہوئے ہیں۔

ان تمثیلوں پر غور کرنے سے قبل ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جیسے ایمان کی تمثیل میں بھی قانونی نہیں حقیقی ایمان کی ماہیت بیان کی گئی ہے اسی طرح یہاں کفر سے مراد قانونی اور ظاہری کفر نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی کفر ہے' مبادا ہم یہ گمان کر لیں کہ یہاں صرف غیر مسلموں اور کھلے کافروں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور ہم مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ گمان اور مغالطہ لاحق ہو گیا تو ان آیاتِ مبارکہ میں قرآن حکیم کی جو ہدایت اور رہنمائی ہے' اس سے ہم محروم رہ جائیں گے۔ واضح رہے کہ جس طرح قانونی ایمان کا تعلق صرف ''قول'' سے ہے اور اس کی اساس شہادت پر ہے' یعنی ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اور حقیقی ایمان کا تعلق تصدیقٌ بالقلب سے ہے اور وہ عبارت ہے یقینِ قلبی سے' اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں اور دو درجے ہیں۔ ایک کفرِ قانونی اور ظاہری ہے' یعنی کھلم کھلا انکار اور ایک کفر باطنی اور مخفی ہے' یعنی ظاہر میں تو اقرار ہے لیکن باطن میں انکار چھپا ہوا ہے' چنانچہ قول کے مطابق عمل موجود نہیں ہے۔ اس کفرِ حقیقی کے بارے میں ہمارے ایک درویش' جن کا انتقال ہو چکا ہے' بڑے کیف کے عالَم میں کہا کرتے تھے کہ ''جو دم غافل' سو دم کافر'' یعنی انسان کا جو وقت بھی غفلت میں بیتتا ہے وہ ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے' جیسے کہ گزشتہ صفحات میں علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کا حوالہ آیا تھا کہ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

الغرض اگر کوئی مسلمان غفلت کے عالَم میں ہو' اللہ کو بھولے ہوئے ہو' اللہ سے محجوب ہو گیا ہو' پردے میں آ گیا ہو تو یہ گمشدگی کی کیفیت ہے جو ایک نوع کا کفر ہے' اگرچہ اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ مزید برآں کفر کے ایک معنی ناشکرا پن بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں وہی مراد ہو۔ بہرحال یہاں کفر کے لیے جو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں وہ کفرِ حقیقی اور کفرِ معنوی کی ہیں' صرف کفرِ قانونی یا کفرِ فقہی کی نہیں۔ یہ وہ باطنی کیفیت

ہے جس میں انسان کا قلب ایمان کے حقیقی نور اور حقیقی روشنی سے محروم ہو' قطع نظر اِس سے کہ ظاہری اور قانونی طور پر وہ مسلمان ہو یا کھلم کھلا بھی کفر ہی کا اظہار کر رہا ہو۔

دوسری تمثیل۔ایمانِ حقیقی سے محروم لوگوں کا انجام

اب اس کفرِ حقیقی و معنوی کی بھی دو کیفیات ہوسکتی ہیں۔ایک تو یہ کہ کوئی شخص ایمانِ حقیقی کے لوازم یعنی اللہ کی ہستی اور توحید کے یقین' اُس کے ساتھ خلوص و اخلاص کے تعلق' آخرت کے یقین اور اُخروی فلاح کے حصول کے جذبے سے تو قطعاً محروم ہو لیکن کسی دوسرے جذبے یا سبب سے کوئی نیکی' کوئی بھلائی اور کسی نہ کسی نوع کا رفاہِ عام اور خدمتِ خلق کا کام کر رہا ہو' جیسے کسی نے کوئی یتیم خانہ کھلوا دیا ہو' یا کوئی کنواں کھدوا دیا ہو' یا کوئی شفا خانہ اور ہسپتال بنوا دیا ہو' یا رفاہی مقاصد کے لیے کوئی فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کر دیا ہو۔اگر یہ سارے کام اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی فوز و فلاح کے حصول کے جذبے کے سوا کسی اور جذبۂ محرکہ کے تحت صادر ہو رہے ہیں تو ان اعمال کی حقیقت پہلی تمثیل میں بیان ہوئی ہے' یعنی:

﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے''۔

یہ ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل ہے' اس لیے کہ دنیا بھر میں یہ بات معروف و معلوم ہے کہ ایک لق و دق صحرا' ایک چٹیل میدان اور وسیع و عریض ریگستان میں ریت کا ایک حصہ اس طرح چمکتا ہے کہ دُور سے دیکھنے والے کو وہ پانی نظر آتا ہے اور پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں ''ظمآن'' کا لفظ ''فعلان'' کے وزن پر آیا ہے۔اسی وزن پر ''رحمان'' آتا ہے' یعنی وہ ہستی جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہو۔ چنانچہ ''ظمآن'' کے معنی ہوں گے وہ شخص جو پیاس سے مرا جا رہا ہو۔اسے ریگستان میں دُور سے پانی نظر آ رہا ہے۔اگرچہ وہ پانی نہیں ہے' محض سراب ہے' لیکن وہ اسے پانی سمجھ کر جس طرح بھی ہو گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا وہاں پہنچتا ہے' لیکن

وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا﴾

''یہاں تک کہ جب وہ اس (سراب) کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی''۔

اس کی حسرت کا اندازہ کیجیے کہ وہ گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا پانی کی اُمید میں وہاں پہنچتا ہے تو اس کو پانی نہیں ملتا' جبکہ وہ وہاں موت کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ اور موت کیا ہے؟ وہ تو درحقیقت ''شاہدرہ'' ہے جس سے گزرنے کے بعد اسے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' لہٰذا فرمایا:

﴿وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ﴾

''اور وہ وہاں اللہ کو موجود پاتا ہے' پس وہ اس کا حساب چکا دیتا ہے''۔

آیت کے اس پورے حصے کا جس کا ہم نے اب تک مطالعہ کیا ہے' مطلب و مفہوم یہ ہے کہ ایسا شخص جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوگا تو اس کو تو گمان ہوگا کہ میں نے دنیا میں بڑے نیک کام کیے تھے' میں نے خیراتی ادارے قائم کیے تھے' میں نے فاؤنڈیشن قائم کیے تھے' میں نے یتیم خانے' شفاخانے اور ہسپتال بنوائے تھے اور متعدد رفاہِ عام کے کام کیے تھے' میں نے ان اداروں کی بلا معاوضہ اعزازی طور پر بے شمار خدمات انجام دی تھیں۔ لہٰذا اسے ان اعمال پر بہت کچھ تکیہ ہوگا' ان کا سہارا ہوگا' لیکن جیسے ریگستان میں دُور سے چمکتی ہوئی ریت پیاسے کو پانی نظر آتی ہے' حالانکہ وہ سراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا' ایسے ہی جب ایسا شخص عدالتِ خداوندی میں محاسبہ کے لیے کھڑا ہوگا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ چونکہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی' بلکہ وہ نورِ ایمان سے خالی اور محض ریاکاری کے جذبے کے تحت شہرت اور ناموری کے حصول کے لیے یا کسی دُنیوی منفعت اور مصلحت کے تحت یعنی انکم ٹیکس بچانے کے لیے یا الیکشن میں ووٹ لینے کے لیے یا سرکار دربار میں رسائی و پذیرائی کے لیے کیے گئے تھے' لہٰذا ان کی آخرت میں کوئی وقعت نہیں' بلکہ وہاں ان کی حیثیت کھوٹے سکّوں کی ہوگی۔ گویا یہ تمام اعمال وہاں سراب ثابت ہوں گے۔ جیسے

دُور سے چمکتی ہوئی ریت پانی نظر آتی ہے جبکہ حقیقت میں پانی موجود نہیں ہوتا' ویسے ہی ان کے یہ اعمال جو ظاہری صورت کے اعتبار سے نیکی اور خیر کے اعمال نظر آتے ہیں' آخرت میں لاحاصل اور بے نتیجہ رہیں گے اور اللہ ان کا حساب چکا دے گا۔ اور اس کی شان یہ ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾﴾

''اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے''۔

اُس کو حساب چکانے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ''الحسیب'' بھی ہے۔ وہ قیامت کے دن ہر انسان کی دُنیوی زندگی کے تمام اعمال ہی نہیں بلکہ اس کی نیتوں' اس کے ارادوں اور اس کے محرکاتِ عمل کا بھی پورا حساب لے گا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی جمع تفریق کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمیں ہوتی ہے۔ اس کے کمپیوٹرز کا کوئی تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ سورۃ الکہف میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب اعمال نامہ سامنے آئے گا تو مجرم لرز اٹھیں گے اور کہیں گے:

﴿يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾

(الکہف:٤٩)

''ہائے ہماری شامت! یہ اعمال نامہ کیسا ہے کہ اس نے کسی چھوٹی بڑی چیز کو چھوڑا ہی نہیں کہ جس کا احاطہ نہ کرلیا ہو!''

اس میں تو باریک ترین تفصیلات کو بھی نہیں چھوڑا گیا' چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی اس میں موجود ہے اور یہ بڑی سے بڑی بات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہی بات سورۃ الزلزال میں فرمائی گئی ہے:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿٧﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿٨﴾﴾

''پس جو کسی کوئی ذرّے کے ہم وزن نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا (اپنے سامنے موجود پائے گا) اور جو کوئی کسی ذرّے کے ہم وزن بدی کمائے گا تو اسے بھی دیکھ لے گا''۔

یاد ہوگا کہ اس سلسلۂ دروس کے درس دوم یعنی آیۂ بِرّ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقی نیکی کیا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾

''بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یومِ آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور نبیوں پر۔''

گویا کوئی عمل جس کی بنیاد میں ایمان نہیں ہے وہ حقیقتاً نیکی نہیں ہے چاہے بظاہر وہ نیکی کا کتنا ہی بڑا عمل نظر آتا ہو' حتیٰ کہ نماز' روزہ اور صدقہ و خیرات تک کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر ان کا مقصد ریاکاری ہو اور یہ کام شہرت کے حصول یا لوگوں پر اپنی دین داری کی دھونس جمانے کے لیے کیے جائیں تو عین شرک قرار پائیں گے۔ آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (۱)

''جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا' جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا' اور جس نے صدقہ و خیرات کیا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا۔''

یعنی اگر اعمال کی بنیاد ایمانِ حقیقی پر ہے اور وہ خالصتاً اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی جزا طلبی کے جذبے کے تحت صادر ہو رہے ہیں تب تو وہ واقعتاً نیکی قرار پائیں گے اور موجبِ اجر و ثواب ہوں گے' بصورتِ دیگر اُن کی حیثیت محض سراب کی سی ہے۔

قرآن مجید میں دو اور مقامات پر بھی یہ مضمون دو نہایت حسین و جمیل تمثیلوں کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ ایک تو سورۃ النور کے فوراً بعد سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾﴾

''اور (جنہیں یہ لوگ بڑے بڑے عمل سمجھ رہے ہیں اور جن پر انہوں نے تکیہ کیا

(۱) مسند احمد۔

ہوا ہے) ہم (قیامت کے دن) اُن کے اِن اعمال کی طرف بڑھیں گے اور انہیں غبار کی طرح (ہوا میں) اڑا دیں گے''۔

بلاتشبیہہ نقشہ بالکل وہی ہوگا جیسے ٹھوکر مار کر کسی چیز کو مشتِ غبار کی صورت ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی اور وہ خالصتاً اللہ کے لیے نہیں کیے گئے تھے۔ دوسری تشبیہہ سورۂ ابراہیم میں وارد ہوئی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ط﴾ (آیت۱۸)

''جن لوگوں نے اپنے ربّ سے کفر کیا ہے (جنہیں اپنے ربّ پر ایمان میسر نہیں ہے) اُن کے اعمال (نیکیاں) اس راکھ کے مانند ہیں جسے کسی جھکڑ والے دن تیز ہوا اڑا کر لے جائے''۔

گویا ان کے لیے نہ کوئی جماؤ اور ٹھہراؤ ہے اور نہ ثبات و دوام۔ آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ﴿۱۸﴾﴾

''وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے''۔

یعنی جسے وہ اپنی کمائی اور کسب سمجھ رہے ہوں گے اور اس پر اجر و ثواب کی امیدیں لگائے بیٹھے ہوں گے' اس میں سے اُن کے ہاتھ کچھ بھی نہ آ سکے گا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہے بہت دُور کی گمراہی اور سب سے بڑی محرومی و ناکامی۔

الغرض کفر کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان حقیقی ایمان سے محرومی کے باعث خلوص و اخلاص سے تو تہی دست و تہی دامن ہو لیکن مضطرب ضمیر کے لیے جھوٹا اطمینان فراہم کرنے کی غرض سے' یا شہرت و عزت کے حصول کی خاطر یا کسی اور دُنیوی منفعت و مصلحت کے لیے نیکی کے کام سرانجام دے رہا ہو تو آیت زیرِ درس کی رو سے ایسی نیکیاں اور اس قسم کے اعمالِ خیر محض سراب کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس سراب کے دھوکے میں گرفتار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ حقائق سے محجوب ہوتے ہیں اور فکر و نظر کی سطح پر مختلف النوع تاریکیوں اور اندھیروں میں بھٹک

رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اِن تاریکیوں اور اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا اُن حضرات کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے بہرہ ور فرمایا ہو۔ جیسے سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول جناب محمد ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (آیت ۹)

''وہی ہے (اللہ) جو اپنے بندے (ﷺ) پر (قرآن مجید کی) روشن آیات نازل فرماتا ہے' تاکہ وہ تمہیں (کفر و ناشکری کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لے آئے''۔

اب جن کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں اور جن کو بھی نورِ ایمان کی کوئی رمق میسر آ گئی ہو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع کو ایمانِ حقیقی کی دعوت دیں' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک (حقیقی) مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔

لہٰذا اگر ایمانِ حقیقی کی روشنی کسی کو میسر آ گئی ہے تو اس کو عام کرنا اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے اور یہ کام اس پر واجب اور فرض ہے!

تیسری تمثیل: کفر کا آخری اور انتہائی درجہ

کفر کا دوسرا یعنی آخری اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ایمان سے محرومی پر مستزاد ضمیر بھی بالکل مُردہ ہو چکا ہو اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی سرے سے مفقود ہو چکی ہو۔ چنانچہ اب انسان کی شخصیت و کردار میں سوائے عریاں نفس پرستی کے اور کچھ نہ رہے اور نیکی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه۔

اور بھلائی ملمع کے درجے میں بھی موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری تمثیل میں یہ انتہائی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ روشنی کی کوئی ایک کرن بھی موجود نہیں' بلکہ انتہائی تاریکی اور تہ بر تہ ظلمتیں ہیں۔ یعنی کامل خودغرضی ہے اور خواہشات وشہوات ہی کی پیروی ہے اور انسان ہوائے نفس ہی کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی اور دکھاوے کا خیر بھی موجود نہیں اور کوئی بھلائی خواہ وہ ملمع ہی کی نوعیت کی ہو' اس کی بھی کوئی کرن سیرت وکردار میں نظر نہیں آتی۔ یہ گویا ضلالت' گمراہی اور گراوٹ کی آخری انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کو یوں تعبیر فرمایا گیا: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ﴾ ''تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں''۔ اس ظلمتِ مطلق اور تاریکیٔ محض کے لیے جو تمثیل یہاں دی گئی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی امیر البحر اسی کی بنا پر ایمان سے مشرف ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے زندگی بھر کبھی سمندری سفر نہیں کیا' جبکہ اس تمثیل کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ تمثیل صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس کی بیشتر زندگی سمندر کے سفر میں گزری ہو اور اسے گہرے سمندر میں اکثر طوفانوں سے سابقہ درپیش آیا ہو اور اسے ذاتی تجربہ ہو کہ سمندر کی گہرائی میں اندھیرے کی کیا کیفیت ہوتی ہے' جبکہ موجوں پر موجیں چڑھی چلی آ رہی ہوں اور اوپر گہرے بادل بھی ہوں کہ ستاروں کی کوئی چمک بھی پانی میں منعکس نہ ہو رہی ہو۔ ایسی مکمل تاریکی کا کوئی تخیل وتصور کسی عام انسان کے لیے ممکن نہیں ہے' لہٰذا یہ تمثیل اور تشبیہہ یا تو وہی شخص دے سکتا ہے جسے عملاً کسی اندھیری رات میں جبکہ گہرے بادل بھی چھائے ہوئے ہوں' سمندر میں کسی طوفان سے سابقہ پیش آیا ہو اور پھر وہ قادر الکلام بھی ہو اور فصاحت و بلاغت سے بدرجۂ تمام وکمال بہرہ ور ہو! یا پھر ایسی تمثیل اور تشبیہہ صرف اللہ ہی بیان کر سکتا ہے جو کُل کائنات کا خالق و مدبّر ہے۔ لہٰذا اُس نے تسلیم کیا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا۔

اب ذرا تمثیل کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا ط﴾

''یا جیسے وہ اندھیرے جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جسے ڈھانپے ہوئے ہو موج' پھر اس کے اوپر چڑھی آ رہی ہو ایک اور موج' اور (پھر مطلع بھی صاف نہ ہو بلکہ) اس کے اوپر بادل (چھائے ہوئے) ہوں۔ (گویا) تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا''۔

گُھپ اندھیرے کے لیے ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا''۔ اس لیے کہ ایک انسان جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے سمت کا شعور تو حاصل ہوتا ہے اور خوب اندازہ ہوتا ہے کہ میرا ہاتھ کدھر ہے' لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنے ہاتھ کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تو معلوم ہوا کہ انتہائی تاریکی ہے اور روشنی کی کوئی رمق بھی موجود نہیں! سبحان اللہ وبحمدہٖ' یہ ہے تمثیل کی معراج اور تشبیہہ کا کمال!

اب اس آیتِ مبارکہ کے آخری حصہ پر توجہ فرمایئے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿٤٠﴾﴾

''اور جس کو اللہ ہی نے نور عطا نہ فرمایا ہو تو اس کے لیے کوئی نور نہیں''۔

نور تو اصل میں ایمان ہے' اگر ایمان میسر نہیں تو پھر نور کہاں؟ اس صورت میں تو تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں!!

اس درس کے آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ جیسے نورِ خارجی اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے ویسے ہی نورِ باطنی حقائق کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا نورِ ایمان نہ ہو تو حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اسی کو بصیرت یعنی باطنی مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری ظاہری بصارت تو وہ حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ کسی عارفِ کامل نے کیا خوب کہا ہے:

دم چیست؟ پیامے است! شنیدی نہ شنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است نہ دیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

یعنی یہ سانس کی آمد و رفت کیا ہے؟ ایک پیغام ہے! تم سنتے ہو یا نہیں سنتے؟ اور تمہارا خاکی وجود ایک نور کی جلوہ گاہ بھی ہے! تم دیکھتے نہیں؟ تو تمہیں چاہیے کہ (حیوانی سمع و بصر سے بلند تر سطح پر) ایک دوسری ہی طرح کا دیکھنا بھی سیکھو اور سننا بھی! واقعہ یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کے بغیر انسان اس ''دیدن دگر'' اور ''شنیدن دگر'' سے محروم رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا تو بہت ہی مشہور ہے کہ: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الحقیقت ہیں!''

علاوہ ازیں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں یہ دعا بھی منقول ہے جو آنحضور ﷺ خاص طور پر فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِیْ نُوْرًا وَفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَلَحْمِیْ نُوْرًا وَدَمِیْ نُوْرًا وَشَعْرِیْ نُوْرًا وَبَشَرِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَعَظِّمْ لِیْ نُوْرًا، اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا)) (۱)

''اے اللہ! میرے دل میں نور عطا فرما، میری بصارت میں نور عطا فرما، میری سماعت میں نور عطا فرما، اور میری داہنی جانب سے نور دے، میری بائیں جانب سے بھی نور عنایت کر، اور میرے اوپر سے نور دے، میرے قدموں تلے سے نور دے، اور میرے سامنے سے نور دے، میری پشت کے پیچھے سے نور دے، اور میرے لیے نور ہی نور کر دے! اور میری زبان میں نور بھر دے، اور میرے رگ و پے میں نور بھر دے، اور میرے گوشت میں نور بھر دے، اور میرے خون میں نور بھر دے، اور میرے بالوں میں نور بھر دے، اور میری کھال میں نور دے، اور میری جان کو نور سے لبریز کر دے اور میرے نور کو فراخ و وسیع فرما دے اور مجھے نور ہی نور عطا کر!''

اس سبق کی پہلی آیت (۳۵) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ ہدایت بخشتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے۔'' اور چونکہ ہدایت کے

مفہوم میں رہنمائی یعنی راستہ دکھا دینے سے لے کر منزلِ مقصود تک بالفعل پہنچا دینے کے جملہ مراحل داخل ہیں لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ رسائی عطا فرما دیتا ہے اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ ولولہ‘ یہ امنگ اور یہ آرزو پیدا فرما دے کہ ہم بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں کفر وشرک‘ الحاد و زندقہ‘ مادہ پرستی‘ ریا کاری‘ منافقت اور قول وعمل کے تضاد کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی میں آ جانے کی توفیق مل گئی ہو! آمین یا ربّ العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربّ العالمین

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الدعوات‘ باب الدعاء اذا انتبه باللیل وصحیح مسلم‘ کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها‘ باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامه۔

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**